رجسٹرڈ ایل ۵۳۲۲

قادیانی اسلامی سیرت کا ٹیسٹ نمونہ صفحہ 18

ہفت روزہ

رفتارِ زمانہ - لاہور

۲۰ ستمبر ۱۹۴۹ء

جلد ۲	ایڈیٹر مبارک احمد خان	نمبر ۱۰

ادارہ تحریر: نیاز حاتم بی اے - ابن حسن جاوید بی اے

سپیشل نمبر

ملتِ بیضا پر ایک عمرانی نظر

از

حکیم ملت ترجمانِ حقیقت حضرت علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال رح

مترجمہ

ظفر الملت والدین حضرت مولانا ظفر علی خان صاحب

مبارک احمد خان ایڈیٹر پرنٹر پبلشر نے ویسٹ پنجاب پرنٹنگ پریس موہن لال روڈ سے چھپوا کر دفتر اخبار رفتار زمانہ میو روڈ لاہور سے شائع کیا۔

قیمت: ۸ آنے

ملتِ بیضا پر ایک عمرانی نظر

از

حکیم ملت ترجمان حقیقت علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال

یہ تحریر دلپذیر

۱۹۱۰ء کے آغاز سرما میں اسٹریچی ہال ایم اے او کالج علیگڑھ میں بزبان انگریزی بیان کی گئی۔

جسے

ظفر الملت والدین حضرت مولانا ظفر علی خان

نے

اردو میں ترجمہ کر کے مئی ۱۹۱۱ء میں حضرت علامہ اقبال کی موجودگی میں ایک جلسۂ عام منعقدہ بریڈلا ہال لاہور میں ایک کثیر مجمع کے سامنے پڑھ کر سنایا

مِلّتِ بیضا پر ایک عِمرانی نظر

انسانی تاریخ کے پارینہ اوراق کو الٹتے وقت جب ہماری نظر ارتقاء کی لامتناہی جھلکیوں میں سے چھنتی ہوئی ان کے رزمیہ میں اسطور پر پڑتی ہے۔ تو کسی خواب سکندر یا نقادوں کی طرح ہم گندی ہوئی قوموں، سلطنتوں اور تمدنوں کے کھنڈروں کو بے جا نیست سے ہست اور ہست سے نیست ہوتے دیکھتے ہیں۔ جس سے زیادہ ہیبت افزا اور حوصلہ فرسا منظر اور کوئی نہیں ہو سکتا قدرت کی قوتوں کی نظر میں نہ افراد کی وقعت ہے۔ نہ اقوام کی منزلت اس کے اٹل قوانین برابر اپنا عمل کئے جا رہے ہیں۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا اس کی منزلِ مقصود بہت ہی دور ہے۔ جسے مقاصدِ انسانی کے آغاز و انجام سے کسی قسم کا تعلق نہیں۔ لیکن

آدمی زادہ طرفہ معجو نیست

باوجود حالات گرد و پیش کی نامساعدت کے اس کی تخیل جو عقل کی آئینہ بردار ہے۔ اسے اپنی ہستی کا کامل تر جلوہ دکھا دیتی ہے اور ان ذرائع کی دریافت پر آمادہ کرتی ہے جو اس تصویر خیالی میں جس کے خط و خال اس کی شانِ اکملیت کو چھپائے ہوئے ہیں۔ جان ڈال سکیں۔ دوسرے حیوانات کے مقابلہ میں انسان بہت ہی کمزور و ناتواں ہے۔ اپنے بچاؤ کے لئے وہ قدرتی حربوں سے مسلح نہیں کیا گیا۔ وہ بصارت تیز سے محروم ہے۔ اس کی قوتِ شامہ اور طاقتِ گریز بہت کم ہے۔ لیکن پھر بھی زندگانی کی آزادیوں اور پہنائیوں کی جستجو میں اس نے اپنی انتھک سرگرمیوں کو ہمیشہ وقف کئے رکھا ہے۔ تاکہ قوانینِ قدرت کی

کبنہ اور طرز عمل سے واقف ہو کر وہ رفتہ رفتہ ان اسباب پر حاوی ہو جائے
جو خود اس کے ارتقاء پر موثر ہیں۔

قانون انتخاب فطری کے اکتشاف عظیم کی بدولت انسان اپنے خانوادہ کی تاریخ کا عقلی
تصور قائم کرنے کے قابل ہو گیا۔ حالانکہ پہلے اس تاریخ کے واقعات کی حیثیت اس کے نزدیک
حوادث کے ایک فوق العادت سلسلہ سے زیادہ نہ تھی۔ جو بلا کسی اندرونی ترتیب یا
غائیت کے فرداً فرداً اور ایام کے سر بستہ اسرار باطن سے پیدا ہو کر گہوارۂ شہود میں
اٹھکیلیاں کرتے ہوئے نظر آیا کرتے تھے۔ اس قانون کے معانی کی تنقید جب اور بھی
زیادہ دقت نظر کے ساتھ کی گئی اور ان فلاسفہ نے جن کی خیال آفرینیاں ڈارون کے
مقدمہ حکمت کا تتمہ ہیں [illegible] کی ہیئت اجتماعی کے دوسرے نمایاں حقائق کا
انکشاف کیا۔ تو تمدنی زندگی کے [illegible] اخلاقی۔ اقتصادی اور سیاسی پہلوؤں کے
متعلق انسان کے تصورات میں [illegible] انقلاب عظیم پیدا ہونے کی صورت نکل آئی۔

علم الحیات کے اصولوں [illegible] نے اس حقیقت پر روشنی ڈالی ہے کہ فرد فی نفسہ
ایک ہستی اعتباری ہے۔ یا یوں کہیئے [illegible] اس کا نام ان مجردات عقلیہ کی قبیل سے ہے جن
کا حوالہ دے کر عمرانیات کے مباحث کے سمجھنے میں آسانی پیدا کر دی جاتی ہے۔ بالفاظ دیگر
فرد اس جماعت کی زندگی میں جس کے ساتھ اس کا تعلق ہے بمنزلہ ایک عارضی و آنی
لمحہ کے ہے۔ اس کے خیالات اس کی تمنائیں اس کا طرز ماند و بود اس کے جملہ قوائے
دماغی و جسمانی بلکہ اس کے ایام زندگانی کی تعداد تک اس جماعت کی ضروریات و حوائج
کے سانچے میں ڈھلی ہوئی ہے جس کی حیات اجتماعی کا وہ محض ایک جزوی مظہر
ہے۔ فرد کے افعال کی حقیقت اس سے زیادہ نہیں۔ کہ وہ بہ سبیل اضطرار

بلا ارادہ کسی ایک خاص کام کو جو جماعت کے نظام نے اس کے سپرد کیا ہے۔ انجام
دے دیتا ہے اور اس لحاظ سے اس کے مقاصد کو جماعت کے مقاصد سے تخالف
کلی بلکہ تضاد مطلق ہے۔ جماعت کی زندگی بالحاظ اپنے اجزاء ترکیبی یعنی افراد
کی زندگی کے بالکل جداگانہ ہوتی ہے۔ اور جس طرح ایک جسم ذوی الاعضاء مریض
ہونے کی حالت میں بعض دفعہ خود بخود بلا علم و ارادہ اپنے اندر ایسی قوتوں کو
برانگیختہ کر دیتا ہے جو اس کی تندرستی کا موجب بن جاتی ہے۔ اسی طرح
ایک قوم جو مخالف قوتوں کے اثرات سے سقیم الحال ہوگئی ہو بعض دفعہ خود بخود
رد عمل کرنے والی قوتوں کو پیدا کر لیا کرتی ہے مثلاً قوم میں کوئی زبردست دل و
دماغ کا انسان پیدا ہو جاتا ہے یا کوئی نئی تخیل نمودار ہوتی ہے۔ یا ایک ہمہ گیر
مذہبی اصلاح کی تحریک بروئے کار آتی ہے جس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ قوم کے قوائے
ذہنی و روحانی تمام باغی اور سرکش قوتوں کو اپنا مطیع و منقاد بنا لیتے اور اس مواد فاسد
کو خارج کر دیتے ہے جو قوم کے نظام جسمانی کی صحت کے لئے مضر تھا۔ قوم کو نئے
سر سے زندہ کر دیتے ہیں اور اس کی اصلی توانائی اس کے اعضاء میں
عود کر آتی ہے اگرچہ قوم کی ذہنی و دماغی قابلیت کا رہنما افراد ہی کے دماغ میں سے
ہو کر چلتا ہے لیکن پھر بھی قوم کا اجتماعی نفس ناطقہ جو مدرک کلیات و جزئیات
اور خبیر و مرید ہے بجائے خود منفرد موجود ہوتا ہے "جمہوری رائے اور قومی
فطرت" وہ جملے ہیں جن کی وساطت سے ہم مرموز و مبہم طور پر اس نہایت
ہی اہم حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں کہ قومی ہستی بذاتِ خود ایک مستقل اور ذوالارادہ ہے
فرد ہے تمام خلائق جلسۂ عام جماعتی انتظامی۔ فرقۂ مذہبی اور مجلس مشاورت وہ مختلف

ذرائع ہیں۔ جن سے قوم اپنی [illegible] تنظیم کا کام لے کر وحدتِ ادراک کی غایت کو حاصل کرتی ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ قومی دماغ تمام ان مختلف خیالات کی خبر یا علم رکھتا ہو۔ جو ایک وقتِ خاص میں افراد کے دماغوں میں مصروف ہوتے ہیں۔ اس لئے کہ خود افراد کا دماغ بھی کامل طور پر اپنی ادراکی حالتوں سے آگاہ نہیں ہوتا۔ اجتماعی یعنی قومی دماغ میں بہت سے احساسات و مقامات و تخیلات قومی حافظے کی دہلیز سے باہر رہتے ہیں۔ قوم کی ہمہ گیر دماغی زندگی کا فقط ایک جزو محدود دروازے کے اندر قدم رکھتا ہے اور قومی ادراک کی تابناک شعاعوں سے منور ہوتا ہے۔ اس انضمام کی بدولت مرکزی اعصاب کی توانائی کی ایک بہت بڑی مقدار غیر ضروری جزئیات پر صرف ہونے سے محفوظ رہتی ہے۔

جو کچھ ہم نے بیان کیا ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ قوم ایک جداگانہ زندگی رکھتی ہے۔ یہ خیال کہ اس کی حقیقت اس سے زیادہ نہیں۔ کہ یہ ہمیشہ موجودہ افراد کا محض ایک مجموعہ ہے۔ اصولاً غلط ہے اور اسی لئے تمدنی و سیاسی اصلاح کی تمام وہ تجاویز جو اس مفروضہ پر مبنی ہوں۔ بہت احتیاط کے ساتھ نظرثانی کی محتاج ہیں۔ قوم اپنے موجودہ افراد کا مجموعہ ہی نہیں ہے۔ بلکہ اس سے بہت کچھ بڑھ چڑھ کر ہے۔ اس کی ماہیت پر اگر نظرِ غائر ڈالی جائے۔ تو معلوم ہوگا۔ کہ یہ غیر محدود و لامتناہی ہے اس لئے کہ اس کے اجزائے ترکیبی میں وہ کثیر التعداد آنے والی نسلیں بھی شامل ہیں۔ جو اگرچہ عمرانی مدِنظر سے فوری مشاہدہ کے ماوراء واقع ہیں۔ لیکن ایک زندہ جماعت کا سب

سے زیادہ اہم جزو تصور ہونے کے قابل ہیں۔ علم الحیات کے اکتشافات
جدیدہ نے اس حقیقت کے چہرے سے پردہ اٹھایا ہے کہ کامیاب حیوانی
جماعتوں کا حال ہمیشہ استقبال کے تابع ہوتا ہے۔ مجموعی حیثیت سے اگر نوع
پر نظر ڈالی جائے تو اس کے وہ افراد جو ابھی پیدا نہیں ہوئے اس کے موجود
افراد کے مقابلہ میں شاید زیادہ بدیہی الوجود ہیں۔ موجودہ افراد کی فوری اغراض
ان غیر محدود نامشہود افراد کی اغراض کے تابع بلکہ ان پر نثار کر دی جاتی ہیں
جو نسلاً بعد نسل تدریجاً ظاہر ہوتے رہتے ہیں اور علم الحیات کی اس حیرت انگیز
حقیقت کو وہ شخص بہ نگاہ استغنا نہیں دیکھ سکتا جس کے پیش نظر سیاسی یا تمدنی
اصلاح ہے۔ میں اپنی قوم کی موجودہ عمرانی حرکت پر اسی پہلو سے نظر ڈالنا
چاہتا ہوں۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو اقوام کے لئے سب سے اہم اور اصلی
عقدہ بلکہ یہ عقدہ ہے خواہ اس کی نوعیت تمدنی قرار دی جائے خواہ اخلاقی
خواہ سیاسی کہ قومی ہستی کا سلسلہ بلا انقطاع کس طرح قائم رکھا جائے۔ مٹنے یا
معدوم ہو جانے کے خیال سے قومیں بھی ویسی ہی خائف ہیں جیسے افراد۔ کسی قوم
کی مختلف عقلی یا غیر عقلی قابلیتوں اور استعدادوں کے محاسن کا اندازہ ہمیشہ اسی
غایت الغایات سے کرنا چاہئے۔ ہم کو لازم ہے کہ اپنے محاسن کو جانچیں اور پرکھیں اور اگر
ضرورت پڑے تو نئے محاسن پیدا کریں۔ کیونکہ بقول نیٹشا کے کسی قوم کی بقا
کا دار و مدار محاسن کی مسلسل و غیر منقطع تولید پر ہوتا ہے۔ گو یہ یقیناً جناب
باری کی حکمت بالغہ کے سانچے میں ڈھلی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ مگر اس کا مضمون سر تا سر
انسانی ہے۔ لیکن اس تبصرہ کے آغاز سے پہلے چند تمہیدی امور سمجھ لینا چاہیے

ہوں۔ اس لئے کہ یہ بحث میرے نزدیک جماعت مسلمین کے متعلق کسی نتیجہ پر پہنچنے کے لئے ضروری ہے۔ یہ امور جن پر میں ترتیب وار نظر ڈالوں گا۔ حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ جماعت المسلمین کی ہیئت ترکیبی۔

۲۔ اسلامی تمدن کی یک رنگی۔

۳۔ اس سیرت کا نمونہ جو مسلمانوں کی قومی ہستی کے تسلسل کیلئے لازمی ہے۔

اول: مسلمانوں اور دنیا کی دوسری قوموں میں اصولی فرق یہ ہے کہ قومیت کا اسلامی تصور دوسری اقوام کے تصور سے بالکل مختلف ہے۔ ہماری قومیت کا اصل اصول نہ اشتراک زبان ہے نہ اشتراک وطن۔ نہ اشتراک اغراض اقتصادی۔ بلکہ ہم لوگ اس برادری میں جو جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم نے قائم فرمائی تھی۔ اس لئے شریک ہیں کہ مظاہر کائنات کے متعلق ہم سب کے معتقدات کا سرچشمہ ایک ہے اور جو تاریخی روایات ہم سب کو ترکہ میں پہنچی ہیں وہ بھی ہم سب کے لئے یکساں ہیں۔ اسلام تمام مادی قیود سے بیزاری ظاہر کرتا ہے اور اس کی قومیت کا دارومدار ایک خاص تہذیبی تصور پر ہے۔ جس کی تجسیمی شکل وہ جماعت انسانی ہے جس میں بڑھنے اور پھیلتے رہنے کی قابلیت طبعاً موجود ہے۔ اسلام کی زندگی کا انحصار کسی خاص قوم کے خصائل مخصوصہ و شمائل مختصہ پر نہیں ہے۔ غرض اسلام زمان و مکان کی قیود سے مبرا ہے اس میں شک نہیں کہ قوم عرب نے جس کے بطن سے اسلام پیدا ہوا۔ اس کی پولیٹکل نشوونما میں بہت بڑا حصہ لیا۔ لیکن اسلامی علوم و فنون۔ اور فلسفہ و حکمت کے اصول و قیود کے مدون کرنے کا کام اور یہ وہ کام ہے جو نفس ناطقہ انسانی کی اعلیٰ زندگی کے کارناموں سے متعلق ہے۔ زیادہ تر غیر عرب اقوام ہی نے انجام دیا۔ معلوم ایسا ہوتا ہے۔ کہ اسلام کا ظہور قوم عرب

ے حق بجانب ہے۔ لیکن میں ان لوگوں کے طرزِ عمل کا یقیناً مخالف ہوں جو اس امر
کے معترف ہونے کے باوجود کہ جذبۂ حبِ وطن قومی سیرت کا ایک قیمتی عنصر ہے۔
مسلمانوں کی عصبیت کو نام دھرتے ہیں اور اسے وحشیانہ تعصب کہہ کر پکارتے ہیں
حالانکہ ہماری عصبیت سے بجز اس کے اور کچھ مراد نہیں۔ کہ اصولِ حبِ نفس بجائے
اس کے کہ ایک فردِ واحد میں ساری و دائر ہو۔ ایک جماعت پر اپنا عمل کرتا ہے
حیوانات کی تمام قومیں کم و بیش ضرور متعصب ہوتی ہیں۔ اور اگر انہیں
اپنی انفرادی یا اجتماعی ہستی برقرار رکھنی ہے تو ضرور ہے بلکہ لازمی ہے۔ کہ
ان میں عصبیت موجود ہو۔ اقوامِ عالم پر نظر ڈالیے ایک قوم بھی ایسی نہ ہوگی
جو پیرایۂ عصبیت سے عاری ہو۔ کسی فرانسیسی کے مذہب پر نکتہ چینی کیجئے وہ
بہت ہی کم متاثر ہوگا۔ اسلئے کہ آپ کی نکتہ چینی نے اس اصول کو مس نہیں
کیا جو اس کی قومیت کی روحِ رواں ہے لیکن ذرا اس کے تمدن۔ اس کے
ملک یا پولیٹیکل سرگرمیوں کے کسی شعبہ کے متعلق اس کی قوم کے مجموعی طرزِ عمل
یا اطوار پر تو خردہ گیری کر دیکھئے پھر اس کی جبلی عصبیت کا شعلہ بھڑک نہ
اٹھے تو ہم جانیں بات یہ ہے۔ کہ فرانسیسی کی قومیت کا انحصار اسکے معتقدات
مذہبی پر نہیں ہے۔ بلکہ جغرافی حدود یعنی اس کے ملک پر ہے۔ پس جب آپ
اس خاص خطۂ زمین پر جسے اسنے اپنے تخیل میں اپنی قومیت کا اصل اصول قرار دے
رکھا ہے معترض ہوتے ہیں۔ تو آپ اس کی عصبیت کو واجبی طور پر برانگیختہ
کرتے ہیں۔ لیکن ہماری حالت اس سے بالکل مختلف ہے۔ ہماری قومیت
ایک شئے موجود فی الذہن ہے۔ موجود فی الخارج نہیں ہے بلحاظ ایک قوم ہونے

کہ ہم جس مرکز پر اگر جمع ہو سکتے ہیں وہ مظاہرِ آفرینش کے متعلق ایک خاص قسم کا
اشتراکِ سمجھوتہ ہے۔ جو ہم نے آپس میں کر رکھا ہے پس اگر کسی کا ہم سے مد
گزر کرنا ہماری آتشِ عصبیت کو برافروختہ کرتا ہے۔ میری دانست میں یہ بر زندگی
اس فرانسیسی کے غصہ سے کچھ کم نہیں ہے جو اپنے وطن کی برائیاں سن کر بجوش کرتا
ہے۔ عصبیت سے صرف قومی پاسداری مراد ہے۔ دوسری اقوام کو بنظرِ تحقیر
دیکھنا اس کے مفہوم میں داخل نہیں ہے۔ بزمانۂ قیامِ انگلستان جب کبھی مجھے
کسی خاص مشرقی رسم یا طرزِ خیال کو کسی انگلش لیڈی یا جنٹلمین کے سامنے بیان کرنے
کا اتفاق ہوا تو مجھے یاد نہیں پڑتا کہ اس پر اظہارِ تعجب نہ کیا گیا ہو۔ جس سے مجھے
رہ رہ کر یہ خیال پیدا ہوتا تھا کہ ان لوگوں کے نزدیک ہر غیر انگلش خیال گویا
عجائباتِ قدرت سے ہے۔ مجھے انگریزی قوم کا یہ وطیرہ نہایت ہی ناپسند ہے۔ اس سے
یہ نہ سمجھا جائے کہ یہ قوم پیرایۂ تخیل سے عاری ہے۔ جس خاک نے شیکسپیئر
ملٹن کیٹس شیلی ٹینی سن اور سوئن برن پیدا کیے ہوں وہ ہمہ خیال آفرینیوں اور [illegible]
آوردیوں سے کیونکر معرا ہو سکتی ہے۔ البتہ یہ بات ہمیں ماننی پڑتی ہے کہ انگلستان
کا طریقِ ماند و بود اور طرزِ غور و فکر وہاں کے آئین و قوانین اور ملکی دستور العمل
اس ملک کے رہنے والوں کی زندگی کے اجزائے لاینفک ہو گئے ہیں۔

غرض مذہبی خیال بلا اس دینی امتیاز کے ہر فرد کی آزادی میں ضروری طور پر
خلل انداز ہو۔ اسلامی جماعت کی ہیئتِ ترکیبی کا مدار علیہ ہے۔ گبن کا قول
ہے۔ کہ چونکہ مذہب ہماری کل ہستی پر حاوی ہے لہٰذا اس کی تاریخ ہماری نشوونما
کی پوری تاریخ کا خلاصہ ہونی چاہیئے۔ یہ قول جیسا ہماری قوم پر صادق آتا ہے

دنیا کسی اور قوم پر نہیں آتا۔ لیکن یہاں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے۔ کہ اگر اسلامی جماعت کی ہیئت ترکیبی کا انتہائی مدار علیہ محض وہ چند معتقدات ہیں جن کی نوعیت مابعد الطبیعی ہے۔ تو کیا یہ بنیاد نہایت ہی متزلزل نہیں ہے؟ خصوصاً ایسی حالت میں جب کہ علوم جدیدہ تیز رفتار ترقی کر رہے ہیں۔ اور ہر بات کے حسن و قبیح کو پرکھنا اور معقولات۔ اور منطقی استدلال سے قدم قدم پر کام لینا ان علوم کا لازمہ قرار دیا گیا ہے۔ مشہور فرانسیسی مستشرق رینان کا یہی خیال تھا۔ اور دوسرے الفاظ میں اس نے یہ امید ظاہر کی تھی کہ اسلام ایک دن دنیا کے ایک بڑے حصے کی عقلی و اخلاقی پیشوائی کے منصب اعلیٰ سے گر جائے گا۔ جن اقوام کی اجتماعی زندگی کا مسلمہ اصول حدود ارضی سے وابستہ ہو۔ انہیں معقولات سے خائف نہ ہونا چاہیئے لیکن ہمارے حق میں یہ ایک خطرناک دشمن ہے۔ اس لئے کہ یہ اسی اصول کو ہلانا چاہتا ہے جس پر ہماری قومی ہستی مبنی ہے اور جس نے ہمارے اجتماعی وجود کو قابل فہم بنا رکھا ہے۔ تعقل در اصل تجربہ ہے اور اسی لئے معقولات سے اس قومی شیرازہ کے بکھر جانے کا اندیشہ ہے۔ جو مذہبی قوت کا باندھا ہوا ہے۔ اگرچہ اس میں شک نہیں کہ ہم معقولات کا توڑ عقلی حربوں سے کر سکتے ہیں۔ لیکن میں جس بات پر زور دینا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ اعتقاد یعنی ہمہ گیر وفاق کا وہ نقطہ جس پر ہماری جماعت کی وحدت منحصر ہے۔ ہمارے لئے اپنے مفہوم کے لحاظ سے عقلی نہیں بلکہ قومی ہے۔ مذہب کو فلسفہ نظری بنانے کی کوشش کرنا میری رائے میں بے سود محض بلکہ لغو و مہمل ہے۔ اس لئے کہ مذہب کا مقصد یہ نہیں ہے۔ کہ انسان بیٹھا ہوا زندگی کی حقیقت پر غور کیا کرے۔ بلکہ اس کی

اصلی غائت یہ ہے کہ زندگی کی سطح کو تدریج بلند کرنے کے لئے ایک مربوط و متناسب عمرانی نظام قائم کیا جائے۔ مذہب سیرت انسانی کا ایک نیا اسلوب یا نمونہ پیدا کرے۔ اس شخص کے اثر کے لحاظ سے جو اس سیرت کا مظہر ہے۔ اس نمونہ کو دنیا میں پھیلانا چاہتا ہے۔ اور اس طور پر چونکہ وہ ایک نئی دنیا کو معیت سے بحث کرتا ہے لہذا اس پر مابعد الطبقات کا اطلاق ہوتا ہے میری مراد ان تمام باتوں سے جو اوپر بیان کی گئی ہیں یہ ہے کہ اسلام کی حقیقت ہمارے لئے یہ نہیں کہ وہ ایک مذہب ہے بلکہ اس سے بڑھ چڑھ کر ہے۔ اسلام میں قومیت کا مفہوم خصوصیات کے ساتھ چھپا ہوا ہے اور ہماری قومی زندگی کا تصور اس وقت تک ہمارے ذہن میں نہیں آسکتا جب تک کہ ہم اصول اسلام سے پوری طرح باخبر نہ ہوں۔ بالفاظ دیگر اسلامی تصور ہمارا وہ ابدی گھر یا وطن ہے جس میں ہم اپنی زندگی بسر کرتے ہیں جو نسبت انگلستان کو انگریزوں اور جرمنی کو جرمنوں سے ہے۔ وہ اسلام کو ہم مسلمانوں سے ہے جہاں اسلامی اصول یا ہماری مقدس روایات کی اصطلاح میں خدا کی رسی ہمارے ہاتھ سے چھوٹی اور ہمارا شیرازہ بکھرا

معاتیح

معتقدات مذہبی کی وحدت جس پر ہماری قومی زندگی کا دارومدار ہے اگر مضافات سے تعبیر کی جائے۔ تو اسلامی تہذیب کی ایک زندگی مبنزلہ اس کے مضاف الیہ کے ہے۔ محض اسلام پر ایمان لے آنا اگرچہ نہایت ہی ضروری ہے۔ لیکن کافی نہیں ہے قومی ہستی میں شریک ہونے کا لازمی عنصر

کے لئے قلب ماہیئت لازمی ہے ۔ اور اس قلب ماہیت کے لئے خارجی
طور پر تو ارکان و قوانین اسلام کی پابندی کرنی چاہیئے ۔ اور اندرونی طور
پر اس یک رنگ تہذیب و شائستگی سے استفادہ کرنا چاہیئے ۔ جو ہمارے
آباؤ اجداد کی مشترکہ عقلی تحریک کا ماحصل ہے ۔ اسلامی جماعت کی تاریخ پر جس قدر
زیادہ غور کیا جائے گا ۔ اسی قدر یہ تاریخ حیرت انگیز و تعجب خیز نظر آئے
گی ۔ اس دن سے جب کہ اسلام کا سنگ بنیاد رکھا گیا ۔ سولھویں صدی کے
آغاز تک یعنی تقریباً ایک ہزار سال کا زمانہ اس بے چین قوم نے ملک گیریوں
اور جہاں کشائیوں میں ۔ صرف کیا ۔ اگرچہ اس ہمہ گیر مشغلہ میں منہمک ہونے
کے باعث انہیں کسی دوسرے شغل کی فرصت نہ ہو سکتی تھی ۔ لیکن پھر بھی اسلامی
دنیا نے علم و حکمت کے قدیم خزانوں کو ڈھونڈ نکالا ۔ اور ان پر اپنی طرف سے
معتدبہ اضافہ کر کے ایک عدیم النظیر لٹریچر کا سرمایہ دنیا کے سامنے
پیش کیا ۔ اور اس کے علاوہ ایک جامع و مانع نظام فقہ کو مدون کیا جو اسلامی
تمدن کا غالباً سب سے زیادہ گراں مایہ ترکہ ہے ۔ جس طرح جماعت مسلمین
ان اختلافات کو جن کی بنا رنگ و خون پر ہو تسلیم نہیں کرتی ۔ اور دنیا کی تمام
نسلوں کو انسانیت کے ہمہ گیر خیال کی سلک میں منسلک کرنا اپنی غائیت سمجھے ہوئے ہے
اسی طرح مسلمانوں کی تہذیب و شائستگی کا معیار بھی عالمگیر ہے ۔ اور ان کا
وجود اور نشو و نما کسی ایک قوم خاص کی دماغی قابلیتوں کا مرہون منت
نہیں ہے ۔ البتہ ایران اس تہذیب و شائستگی کی نشو و نما کا جزو
اعظم قرار پا سکتا ہے ۔ اگر مجھ سے سوال کیا جائے کہ تاریخ اسلام کا سب سے

بہت اہم واقعہ کونسا ہے تو میں بلاتامل اس کا جواب دونگا کہ فتح ایران۔ معرکہ نہاوند نے عربوں
کو نہ صرف ایک خوبصورت سرزمین کا مالک بنا دیا بلکہ ایک قدیم قوم پر بھی متسلط کر دیا۔ جو سامی
اور آریہ مسالے سے ایک نئے تمدن کا محل تعمیر کرنے کی قابلیت رکھتی تھی۔ ہمارا اسلامی
تمدن سامی تفکر اور آریہ تخیل کے اختلاط کا حاصل ہے۔ جب ہم اس کے خصائل و شمائل پر
نظر ڈالتے ہیں۔ تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اس کی نزاکت و دلربائی اسے اپنی آریہ
ماں کے بطن سے اور اس کا وقار و متانت اسے اپنے سامی باپ کے صلب سے ترکہ
میں ملا ہے۔ فتح ایران کی بدولت مسلمانوں کو وہی گراں مایہ چیز ہاتھ آئی جو تسخیر یونان کے
بعد اہل روما کے حصہ میں آئی تھی۔ مگر ایران نہ جیتا تو ہمارے تمدن کی تصویر بالکل یکرخی ہوتی
یہاں ضمناً اس امر کا ذکر کرنا بیجا نہ ہوگا۔ کہ وہ قوم جس کے اختلاط نے عربوں اور مغلوں
کی نسل میں جان ڈال دی۔ عقلی و دماغی لحاظ سے مردہ نہیں ہے۔ ہاں ایران جس کی پولیٹیکل آزادی
کو روس کی غاصبانہ آرزوؤں نے معرض خطر میں ڈال رکھا ہے۔ ابھی تک اسلامی تہذیب کا
ایک بڑا مرکز ہے اور ہم لوگوں کی دلی تمنا ہے کہ اسلامی دنیا میں اس کا وہ درجہ جو اب تک قائم رہا
آیا ہے۔ بدستور قائم رہے۔ ایران کے شاہی خاندان کے لئے ایران کی پولیٹیکل آزادی کا
نقصان فقط اس کا ہم معنی ہوگا کہ زمین کا ایک ٹکڑا ان کے قبضہ سے نکل گیا۔ لیکن اسلامی
تہذیب کے لئے یہ واقعہ تیرھویں صدی کے تاتاری حملہ سے بھی زیادہ خانہ برانداز و حسرت انگیز
ہوگا۔ بہرحال یہ ایک پولیٹیکل بحث ہے جس میں اس وقت میں نہیں پڑنا چاہتا۔ میرا مدعا یہ
ثابت کرنا چاہتا ہوں کہ جماعت مسلمین کا زندہ رکن بننے کے لئے انسان کو مذہب اسلام پر
باخود ایمان رکھنے کے علاوہ اسلامی تہذیب کے رنگ میں اپنے تئیں پوری طرح رنگ لینا چاہیئے
صفت ... اس قوم میں ... نکالنے کا مدعا یہ ہے کہ مسلمان دو۔ نئی جدید ترکیب ڈھنگ ہو جائیں ان کا

ذہنی منظر ایک ہو وہ مظاہر آفرینش پر ایک خاص پہلو سے نظر ڈالیں اشیاء کی ماہیت اور
قیمت کو اس انداز سے سمجھنا چاہتیں جو جماعت اسلامی اور دوسری جماعتوں کا باب الامتیاز
ہے۔ اور جو مسلمانوں کو ایک ذہنیت مخصوص مقصد معین کے پیرایہ سے آراستہ کر
ذہن کل تغیر۔ "اخوت" کی کتاب کے اوراق بتا رہا ہے۔

غالباً پیش بینی کے تحت میں ہم نے جو کچھ بیان کیا ہے اس سے واضح ہو گیا ہو گا کہ صالح
سیرت کے نمونے کی نمایاں خصوصیات کیا کیا ہونی چاہئیں۔ لیکن یہ جتا دینا ضروری ہے
اس سیرت کے دو مختلف نمونے جنہیں ہم قوم پسندیدگی کی نظر سے دیکھتی رہی ہے سخت اخلاق
کی کور ذوقوں کا حاصل نہیں ہیں۔ زمانہ حال کا علم عمرانیات ہمیں یہ نکتہ سکھاتا ہے کہ قوموں
کا اخلاقی تجربہ خاص خاص قوانین حیات کا تابع ہوا کرتا ہے۔ زمانہ قبل تاریخ میں جبکہ زندہ
رہنے کیلئے انسان کو سخت جد و جہد کرنی پڑتی تھی اور دماغی قابلیتوں کے مقابلہ میں
جسمانی قوتوں سے زیادہ کام لینا پڑتا تھا تو اسی شخص کی سب تعریف و تقلید کرتے تھے۔ جو شجاع
ہوتا تھا جب جہد للبقاء کی کشمکش فرو ہوئی اور خطرہ زائل ہو گیا۔ تو دور شجاعت گیا۔ اور
بالاصطلاح گو نفس اور مروت آیا جس میں جرأت اور دلاوری اگرچہ پھر بھی مستحسن سمجھی
جاتی تھی۔ لیکن انسانی سیرت کا ہیرو لطف نیز اور علم پسند نمونہ وہ شخص متصور ہوتا تھا جو
فنون لطیفہ کی ہر صنعت کا رسیا ہو۔ اور فیاضی، ایثار اور ہم نوائی و ہم پیمائی کے گونا گوں
اوصاف سے متصف ہو لیکن ان دونوں اسالیب کا میلان چونکہ غلو و افراط کی جانب
تھا۔ ان کے عمل کا رد ایک تیسرے نمونہ یا اسلوب نے کیا۔ جس کی غایت انانیت
ضبط نفس ہے۔ جو زندگی پر زیادہ متانت و تقشف کے ساتھ نظر ڈالتا ہے
ہندوستان میں جب ہم اسلامی جماعت کے ارتقاء کی تاریخ پر نظر ڈالتے ہیں۔ تو

ہمیں تیموری اسلوب اوّل کا مظہر نظر آتا ہے۔ بابر اسالیب اوّل و دوم کے امتزاج
کو ظاہر کرتا ہے۔ جہانگیر اسلوب ثانی کے سانچے میں خصوصیت کے ساتھ ڈھلا ہوا ہے۔
اور عالمگیر جس کی زندگی اور کارنامے میری دانست میں ہندوستان کی اسلامی قومیت کے
نشوونما کا نقطۂ آغاز ہیں اسلوب ثالث کا چہرہ کشا ہے۔ ان لوگوں کے نزدیک جنہوں نے عالمگیر
کے حالات تاریخ ہند کے مغربی شارحین کی زبانی سنے ہیں عالمگیر کا نام سفاکی، قساوت، جبر و
استبداد، مکاری اور غداری اور پولیٹکل سازشوں اور منصوبوں کے ساتھ وابستہ ہے۔ تعصب
مخاصمت کا خوف ملا ہے۔ ورنہ میں معاصرانہ تاریخ کے واقعات کی صحیح تعبیر و تفسیر ہوتا
تو کہ عالمگیر کی پولیٹکل زندگی کی وجوہ تحریک ہر امر جائز و حق بجانب تھیں۔ اس کے علاوہ ذمہ دار
مکتوبات کے واقعات کا بنظر انتقاد مطالعہ کر لینے کے بعد مجھے یقین واثق ہو گیا ہے کہ جو الزامات
اس پر لگائے جاتے ہیں وہ واقعات معاصرہ کی غلط تعبیر اور ان تمدنی و سیاسی قوتوں
کی غلط فہمی پر مبنی ہیں جو ان دنوں سلطنت اسلام کے طول و عرض میں عمل کر رہی
تھیں۔ میری رائے میں قومی سیرت کا وہ اسلوب جس کا سایہ عالمگیر کی ذات تھی اپنے
ٹھیٹھ اسلامی سیرت کا نمونہ ہے اور ہماری تعلیم کا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ اس نمونہ
کو ترقی دی جائے اور مسلمان ہر وقت اسے پیش نظر رکھیں۔

اگر ہمارا مقصد یہ ہو کہ ہماری قومی ہستی کا سلسلہ ٹوٹنے میں نہ آئے تو ہمیں ایک
ایسا اسلوب سیرت تیار کر لینا چاہیے۔ جو اپنی خصوصیات مختصہ سے کسی صورت میں
بھی علیحدگی اختیار نہ کرے اور خصوصاً صفات و مسالک کے
دینی اصول کو پیش نظر رکھ کر دوسرے اسالیب کی خوبیوں کو اخذ کر لے جو ہے
ان تمام عناصر کی آمیزش سے اپنے وجود کو کمال احتیاط کے ساتھ پاک کر دے جو اس کی
روایات مسلمہ اور قوانین منضبطہ کے منافی ہوں۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی عمرانی
کو بہ نگاہ غور دیکھنے سے اس حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے جو قوم کے

نہ ہو جائے گا۔

(۱) جماعت اسلامی سے جس فرد کو تعلق ہو۔ اس کا ذہنی سرمایہ اس دولت سے مملو ہونا چاہیے۔ جو اسکے آبا و اجداد کی دماغی قابلیتوں کا ماحصل ہے۔ تاکہ وہ ماضی و مستقبل کے ساتھ حال کے ربط و تسلسل کو محسوس کرتا ہے۔

(۲) ایسے مسائل پر شامل اس خاص اسلوب سیر کے مطابق ہوں جس کو میں نے اسلامی ادب میں ہم ان کے مختلف شعبوں میں مسلمانوں کے قومی کارناموں کی قدر و قیمت کا اندازہ لگاتا ہوں۔ اسلامی دنیا نے جہاں ربانی مذہب۔ ادب، حکمت، اور ہنر میں۔ وقائع نگاری صنعت، زراعت اور تجارت کی اشاعت میں جو کام کیا ہے اس کی مجموعی تنقید کی تفہیم جلد ہی کی متقاضی ہوگی۔ عالم اسلام میں جو واقعات اس وقت پیش آرہے ہیں۔ وہ نہایت ہی معنی خیز ہیں۔ اور ان پر تفحص کی نگاہ ڈالنا بہت سبق آموز ثابت ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ کام بہت محنت طلب ہے۔ اور میں اس کی انجام دہی سے قاصر ہوں۔ اس لئے میرا تبصرہ فقط مسلمانان ہند کے کارناموں سے متعلق ہوگا۔ اس موضوع پر بھی ان مختلف مسائل کی نسبت جو ہمیں در پیش ہیں۔ میں شرح و بسط کے ساتھ رائے زنی نہیں کر سکوں گا۔ میں صرف دو امور پر بحث کروں گا۔ (۱) تعلیم اور (۲) عامۃ خلائق کی عام حالت کی اصلاح۔

گذشتہ پچاس برس کے دوران میں مسئلہ تعلیم ہماری جدوجہد اور سرگرمیوں کا نصب العین بنا رہا ہے۔ یہ سوال کرنا بیجا نہ ہوگا کہ کیا اشاعت تعلیم میں ہم نے کسی خاص غائیت کو پیش نظر رکھا ہے۔ یا مستقبل کی طرف سے غافل ہو کر محض حال کی فوری اغراض کا لحاظ کیا ہے۔ ہم نے کسی قسم کے تعلیم یافتہ اشخاص پیدا کئے ہیں؟ آیا ان اشخاص کی تعلیم ایسی ہے جس سے ہم مسلمانوں کی سی مخصوص الترکیب جماعت کی عمرانی ہستی کے تسلسل کی کفیل ہو سکے۔ ان سوالات کے جوابات کئی قبیلہ پیشتر ہی دیئے جا چکے ہیں۔ علم النفس کے اصول سے ہر ...

ہمیں اچھی طرح معلوم ہے کہ نفس ناطقہ کی وہ کیفیت، جسے استبصار یا ہوشیاری سے تعبیر کرتے ہیں، ذہنی حالتوں کے باقاعدہ تواتر پر منحصر ہوتی ہے جب نفس ناطقہ کے سلسلۂ ہوشیاری میں خلل واقع ہو جاتا ہے۔ تو نفس بیمار پڑ جاتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قوائے حیوانی رفتہ رفتہ تحلیل ہو جاتے ہیں۔ یہی حالت اقوام کے نفس ناطقہ کی ہے جس کا تسلسل اس اجتماعی تجربہ کے باقاعدہ انتقال پر ہے جو نسلاً بعد نسلٍ قوم کو سینہ بسینہ اسلاف سے میراث میں پہنچتا رہتا ہے۔ تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ اس توارث حوادثیہ کی مدد ہو کر نفس ناطقہ قومی کو استبصار کامل بنا دے۔ تاکہ وہ اپنی ذات کے ادراک پر قادر ہو سکے۔ فرد کا بطور ایک فرد اتحاد اس قوم کے ساتھ جس کا وہ جزو ہے اگر رابطہ ہو سکتا ہے تو اسی دانستہ کی بخشش سے۔ تعلیم کے ذریعہ سے روایات مجتمع کے جو مختلف اجزا اس طور پر منتقل کئے جاتے ہیں۔ وہ نفس ناطقہ قومی میں جذب ہو کر پیوست ہو کر ان حیثیت افراد و قوم کے لئے میل و فرسنگ کا کام دیتے ہیں۔ جن کی پوری زندگی اور کل قابلیت مع غور و فکر قوم کے مختلف غایات و مقاصد کی منزلیں طے کرنے میں گزر جاتی ہے۔ مثلاً ایک قوم کی تاریخی اور علمی روایات اس قوم کے معتقدوں، مورخوں اور انشاپردازوں کی چشم بصیرت کے سامنے ہر وقت ایک نمایاں شکل میں موجود رہتی ہیں۔ اگرچہ قوم کو مجموعی حیثیت سے ان روایات کا ادراک موہوم و مبہم طور پر ہوتا ہے۔ اس نقطۂ خیال سے اگر ہم اپنے تعلیمی کارناموں کی قدر و قیمت کا اندازہ لگائیں۔ تو معلوم ہوگا۔ کہ موجودہ نسل کا نوجوان مسلمان تو اس کا سیرت کے اسالیب کے لحاظ سے ایک بالکل نئے اسلوب کا حامل ہے جس کی عقلی زندگی کی تصویر کا پردہ اسلامی تہذیب کا پردہ نہیں ہے حالانکہ اسلامی تہذیب کے بغیر میرا دعویٰ ہے وہ محض نام کا مسلمان بلکہ اس سے بھی کچھ کم ہے اور وہ بھی اس صورت

ہیں کہ اس کی خالص دنیوی تعلیم نے اس کے مذہبی عقائد کو متزلزل کر دیا۔
اور اس کا دماغ مغربی خیالات کی جولانگاہ بنا ہوا ہے۔ سو میں علی رؤس الاشہاد
کہتا ہوں کہ اپنی قومی روایات کے سرمایہ سے عاری ہو کر اور مغربی لٹریچر کے نشہ
میں ہر وقت سرشار رہ کر اس نے اپنی قومی زندگی کے ستون کو اسلامی مرکز ثقل
سے بیت پر سے ہٹا دیا۔ بے خوف و تردید میرا یہ دعویٰ ہے کہ دنیا کی کسی قوم نے
ایسی اعلیٰ اور قابل تقلید مثالیں اپنے افراد میں پیدا نہیں کیں جیسی [illegible] قوم نے
لیکن بایں ہمہ ہمارے نوجوان کو جو اپنی قوم کی سوانح عمری سے بالکل نابلد ہے مغربی
تاریخ کے مشاہیر سے استفادہ اور استمداد رجوع کرنا پڑتا ہے۔ عقلی و ادراکی
لحاظ سے وہ مغربی دنیا کا غلام ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ اس کی روح اس صحیح علم
دوری کے عنصر سے خالی ہے جو اپنی قومی تاریخ اور قومی لٹریچر کے مطالعہ
سے پیدا ہوتی ہے۔ ہم نے اپنی تعلیمی جدوجہد میں اس حقیقت پر جس کا اعتراف
تجربہ ہم سے تکرار کرتا ہے نظر نہیں ڈالی کہ افسانہ کے تمدن کو جو مشارکت
سے اپنا ہر وقت کا رفیق بنائے رکھنا گویا اپنے تئیں اس تمدن کا حلقہ
بگوش بنا لینا ہے۔ یہ وہ حلقہ بگوشی ہے جس کے نتائج کسی دوسرے
مذہب کے دائرہ میں داخل ہونے سے بڑھ کر خطرناک ہیں۔ کسی اسلامی
مصنف نے اس حقیقت کو مولانا اکبر الہ آبادی سے زیادہ واضح طور پر
نہیں بیان کیا جو نئی نسل کے مسلمانوں کی موجودہ عقلی زندگی پر ایک نظر غائر
ڈالنے کے بعد حسرت آمیز لہجہ میں پکار اٹھتے ہیں ؎

شیخ مرحوم کا یہ قول مجھے یاد آتا ہے

دل بدل جائیں گے تعلیم بدل جانے سے

محروم کرتا ہے۔ حقیقی اسلامی تہذیب کے اس قدامت پسند نام لیوا سے جو

مغربی تعلیم کے بارہ میں سر سید خان مرحوم کے ساتھ حضرت اکبر کا جھگڑا کیا۔ آج ہمیں معلوم ہوتا ہے۔ کہ ہمارے شیخ کا خوف بے بنیاد نہ تھا۔ کیا اب بھی کسی کو اس امر کا شبہ ہے۔ کہ شیخ مرحوم کے قول میں جو سچائی کا شائبہ مضمر ہے۔ اس پر ہماری تعلیم کا ماحصل زندہ گواہ ہے۔ مجھے امید ہے کہ ان کی کڑوی کسیلی باتوں کے سننے والے مجھے معاف فرمائیں گے۔ آجکل کی طالب العلمانہ زندگی سے چونکہ گذشتہ دس بارہ سال کی مدت میں مجھے سابقہ پڑا ہے اور میں ایک ایسے مضمون کا درس دے رہا ہوں جس کو مذہب تہذیب کا تعلق ہے۔ لہذا میں اس بات کا تھوڑا بہت استحقاق رکھتا ہوں کہ میری باتیں سُنی جائیں گی۔ مجھے روزہ کر یہ تجربہ ہوا ہے۔ کہ مسلمان طالب علم اپنی قوم کے عمرانی۔ اخلاقی اور سیاسی تصورات سے نابلد ہے۔ روحانی طور پر وہ ایک بے جان لاش کی سی ہے اور اگر موجودہ صورت حالات اور بیس سال تک قائم رہی تو وہ اسلامی روح جو قدیم اسلامی تہذیب کے چند علمبرداروں کے افسردہ قالب میں ابھی تک زندہ ہے۔ ہماری جماعت کے جسم سے بالکل ہی نکل جائے گی۔ وہ لوگ جنہوں نے تعلیم کا یہ اصل الاصول قائم کیا تھا۔ کہ ہر مسلمان بچہ کی تعلیم کا آغاز قرآن مجید کی تعلیم سے ہونا چاہئیے وہ ہمارے مقابلہ میں ہماری قوم کی ماہیت وحدت سے زیادہ باخبر تھے۔

ہماری قومی سرگرمیوں کا محرک اقتصادی اغراض ہی نہیں ہونی چاہئیں ـــ قوم کی وحدت کی بقا اور اس کی زندگی کا تسلسل قومی آرزوؤں کا ایک اعلیٰ نصب العین ہے جو فوری اغراض کی تکمیل کے مقابلہ میں بے حد زیادہ اشرف و اعلیٰ ہے۔ ایک قلیل البضاعت مسلمان جو سینہ میں ایک درد بھرا اسلامی دل رکھتا ہو۔ میری رائے میں قوم کے لئے بمقابلہ اس بیش قرار تنخواہ پانے والے مسلمان [illegible] گریجوایٹ کے زیادہ سرمایۂ ناز ہے

ہے۔ جن کی نظروں میں اسلام اصول زندگی نہیں ہے۔ بلکہ محض ایک آلۂ
جلب منفعت ہے۔ جس کے ذریعہ سے بڑے بڑے سرکاری عہدے اونچی
تنخواہوں میں حاصل کئے جاسکتے ہیں۔ میری ان باتوں سے یہ خیال نہ کیا جائے
کہ میں مغربی تہذیب کا مخالف ہوں۔ اسلامی تاریخ کے ہر مبصر کا مطالعہ اس امر
کا اعتراف کرنے پر مجبور کرے گا۔ کہ ہمارے عقلی و ادبی گہوارے کو جلا بخشنے
کی خدمت مغرب نے ہی انجام دی ہے۔ فلسفیانہ تخیل کی سرزمین میں ہم
لوگ ابھی تک بجائے عربی یا ایرانی ہونے کے زیادہ تر یونانی نظر آتے
ہیں۔ باوجود اس کے کسی کو انکار نہ ہوگا کہ خود ہماری خالص اسلامی
تہذیب اپنی مثال آپ ہے۔ اور تعلیم کا کوئی جدید اسلامی نظام مسلمین
کی قومیت پر مبنی ہو۔ اسے مجموعی نظر انداز نہیں کرسکتا۔ اسلامی یونیورسٹی کے
خیال کا ہمارے دل میں پیدا ہونا حقیقت میں ہماری قومی ہستی کے حق میں
ایک مبارک علامت ہے۔ جب ہم اپنی قوم کی نوعیت پر نظر ڈالتے ہیں۔ تو
اس قسم کے دارالعلوم کی ضرورت میں شک وشبہ کی گنجائش نہیں رہتی
بشرطیکہ یہ دارالعلوم ٹھیٹھ اسلامی اصول پر چلایا جائے۔ کوئی قوم اس
رشتہ کو یکایک نہیں توڑ سکتی۔ جو اسے اس کے ایام گذشتہ سے جوڑے
ہوئے ہے۔ اور مسلمانوں کے لئے تو اس تعلق کو چھوڑ دینا اور بھی
محال ہے۔ جن کی مجموعی روایات ان کی قومیت کی جان ہیں۔ مسلمان کو بیشک
علوم جدیدہ کی تیز رفتار کے قدم بقدم چلنا چاہیئے۔ لیکن یہ بھی ضرور
ہے۔ کہ اس کی تہذیب کا رنگ خالص اسلامی ہو۔ اور یہ اس وقت تک نہیں
ہوسکتا۔ جب تک کہ ایک ایسی یونیورسٹی موجود نہ ہو جسے ہم اپنی قومی تعلیم
کا مرکز قرار دے سکیں۔ ہم کو یہ سمجھ لینا چاہیئے۔ کہ اگر ہماری قوم

کے نوجوانوں کی تعلیمی اٹھان اسلامی نہیں ہے۔ تو ہم اپنی قومیت کے
پودے کو اسلام کے آب حیات سے نہیں سینچ رہے ہیں۔ اور اپنی جماعت میں
پکے مسلمان کا اضافہ نہیں کر رہے ہیں۔ بلکہ ایک ایسا نیا گروہ پیدا کر رہے
ہیں۔ جو جب کسی اکتسابی یا اعتقادی مرکز کے نہ ہونے سے اپنی شخصیت کو
کسی دن کھو بیٹھے گا۔ اور گرد و پیش کی ان قوموں میں سے کسی ایک قوم میں
ضم ہو جائیگا۔ جسمیں اسکی نسبت زیادہ قوت و جان ہوگی۔

لیکن ہندوستان میں اسلامی یونیورسٹی کا قائم ہونا ایک اور لحاظ سے بھی
نہایت ضروری ہے۔ کون نہیں جانتا کہ ہماری قوم کے عوام کی اخلاقی تربیت
کا کام ایسے علماء اور واعظ انجام دے رہے ہیں جو اس خدمت کی انجام دہی
کے پوری طرح سے اہل نہیں ہیں۔ اسلئے کہ ان کا مبلغ علم اسلامی تاریخ اور اسلامی
علوم کے متعلق نہایت ہی محدود ہے۔ اخلاق اور مذہب کے اصول و فروع
کی تحقیق کے لئے موجودہ زمانہ کے علوم کو تاریخ اقتصادیات اور عمرانیات
کے حقائق عظیمہ سے آشنا ہونے کے علاوہ اپنی قوم کے کلچر اور تخیل میں پوری
دسترس رکھنی چاہئے۔ ندوہ۔ علیگڑھ کالج۔ مدرسہ دیوبند اور اس قسم کے
دوسرے مدارس جو الگ الگ کام کر رہے ہیں۔ اس بڑی ضرورت کو رفع نہیں
کر سکتے۔ ان تمام بکھری ہوئی قوتوں کا شیرازہ بند ایک وسیع تر غرض کا مرکزی
دار العلوم ہونا چاہئے جہاں افراد قوم نہ صرف خاص قابلیتوں کو نشو و نما دینے
کا موقع حاصل کر سکیں۔ بلکہ تہذیب کا وہ اسلوب یا سانچہ تیار کیا جا سکے
جس میں زمانہ موجودہ کے ہندوستانی مسلمان کو ڈھلنا چاہئے۔ پس یہ امر قطعی
طور پر ضروری ہے۔ کہ ایک نیا خیالی دار العلوم قائم کیا جائے۔ جس کی مسند نشین
اسلامی تہذیب ہو۔ اور جس میں قدیم و جدید کی آمیزش عجیب دلکش انداز سے

ہوئی ہو۔ اس قسم کی تصویر خیالی کھینچنا آسان کام نہیں ہے۔ اس کے لئے اعلیٰ
تخیل۔ زمانہ کے رجحانات کا لطیف احساس اور مسلمانوں کو تاریخ اور مذہب
کے مفہوم کی صحیح تعبیر لازمی ہے۔

اس بحث کے خاتمہ سے پہلے میں مسلمان عورتوں کی تعلیم کے متعلق چند کلمات
کہنا ضروری سمجھتا ہوں۔ اسلام میں عورتوں کا جو درجہ ہے۔ اس پر تفصیلی روشنی
کرنے کی یہاں گنجائش نہیں۔ البتہ کھلے کھلے لفظوں میں اس امر کا اعتراف میں
ضرور کرونگا۔ کہ بلحاظ آیۂ کریمہ اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَى النِّسَاءِ
میں مرد اور عورت کی مساوات مطلق کا دعویٰ نہیں ہو سکتا۔ یہ ظاہر ہے کہ قدرت
نے ان دونوں کے تفویض جدا جدا خدمتیں کی ہیں اور ان فرائض جداگانہ
کی صحیح اور باقاعدہ انجام دہی خانوادۂ انسانی کی صحت اور فلاح کے لئے
لازمی ہے۔ مغربی دنیا میں جہاں نفسی نفسی کا ہنگامہ گرم ہے اور غیر معتدل اشتراکیت
نے ایک خاص قسم کی اقتصادی حالت پیدا کر دی ہے عورتوں کو آزاد کر دیا جانا ایک
ایسا تجربہ ہے جو میری دانست میں بجائے کامیاب ہونے کے نقصان
رساں ثابت ہوگا۔ اور نظام معاشرت میں اس سے پیچیدگیاں واقع ہو جائیں
گی۔ اور عورتوں کی اعلیٰ تعلیم سے بھی جس حد تک کہ فرد اور قوم کی شرح ولادت
کا تعلق ہے جو نتائج مرتب ہوں گے وہ بھی نا پسندیدہ ہوں گے۔ مغربی دنیا میں
جب عورتوں نے گھر کی چار دیواری سے باہر نکل کر کسب معاش کی جدوجہد میں مردوں
کا ساتھ دینا شروع کیا۔ تو خیال کیا جاتا تھا۔ کہ ان کی یہ اقتصادی حریت مطلق
کی بے روزگاری میں معتد بہ اضافہ کرے گی۔ لیکن تجربہ نے اس خیال کی
نفی کر دی۔ اور ثابت کر دیا۔ کہ خانگی وحدت کے رشتہ کو جو بنی نوع
انسان کی روحانی زندگی کا جزو اعظم ہے۔ یہ حریت توڑ دیتی ہے

میں اس حقیقت کے اعتراف کے لئے آمادہ ہوں کہ زمانہ حال
میں کسی جماعت کا محض سماجی قوتوں کے ذریعہ سے نشوونما
پانا محال ہے۔ ریل تار نے زمان اور مکان کے پردہ کو درمیان سے
اٹھا سا دیا ہے۔ اور دنیا کی مختلف قومیں جن میں پہلے بعد المشرقین
حائل تھا۔ اب پہلو بہ پہلو بیٹھی ہوئی نظر آتی ہیں۔ اس ہم نشینی
کا یہ نتیجہ ہو سکنے والا ہے۔ کہ بعض قوموں کی حالت بدل کر رہ
جائے گی۔ اور بعض قومیں بالکل ہی نیست و نابود ہو جائیں گی۔ جو عظیم الشان
اقتصادی عمرانی۔ اور سیاسی قوتیں اس وقت دنیا میں
اپنا عمل کر رہی ہیں۔ ان کے نتائج کے بارے میں کوئی شخص
پیش بندی کی رائے قائم نہیں کر سکتا۔ لیکن ہمیں یہ یاد رکھنا
چاہیے۔ کہ جو کسی کے لئے بغرض تکمیل صحت اپنی تمدنی آب و
ہوا کی جبلی کے طور پر کسی غیر قوم کے تمدن کے عنصر کا اخذ و جذب
کرنا قرین مصلحت بلکہ لازمی ہی کیوں نہ ہو لیکن اگر اغیار کی تقلید
میں شتاب زدگی و بے سلیقگی سے کام لیا گیا۔ تو نظام قومی
کے اعضائے رئیسہ میں اختلال عظیم کے پیدا ہونے کا خطرہ
ہوگا۔ اقوام کے تمدن میں ایک پہلو عمومیت کا ہوا کرتا ہے۔ لیکن
ان کی معاشرت کی رسموں اور سیاسی دستوروں میں
خصوصیت شخصی کی شان نظر آتی ہے۔ یہ رسوم اور یہ دستورات
ان قوموں کی تاریخی زندگی اور ان کی خاص روایات سے اثر پذیر
ہوتی ہیں۔ پس اپنی قوم کی خاص نوعیت اسلام کی تعلیم اور
عالم قبہ ان کے متعلق علم الاعضاء و علم الحیات کے انکشافات کو

یہ نظریہ رکھنے کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچے بغیر نہیں رہ سکتے۔ کہ مسلمان
عورت کو جماعت اسلامی میں بدستور اسی حد تک محدود رہنا چاہیئے
جو اسلام نے ان کے لئے مقرر کر دی ہے۔ اور جو حد کہ اس کے
لئے مقرر کی گئی ہے۔ اس کے لحاظ سے اس کی تعلیم ہونی چاہیئے۔
ہم نے سطور بالا میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔
کہ ہماری جماعت کا شیرازہ اسی وقت تک بندھا رہ سکتا ہے۔
جبتک کہ مذہب اسلام اور تہذیب اسلام کو ہم پر قابو
ہے۔ چونکہ عورت کے دل و دماغ کو مذہبی تخیلات کے ساتھ ایک
خاص مناسبت ہے۔ لہذا قومی ہستی کی مسلسل بقا کے لئے یہ بات
نہایت ضروری ہے۔ کہ ہم اپنی عورتوں کو ابتدا میں خالص مذہبی
تعلیم دیں۔ جب وہ مذہبی تعلیم سے فارغ ہو چکیں۔ تو ان کو اسلامی
تاریخ۔ علم تدبیر۔ خانہ داری اور علم اصول حفظ صحت پڑھایا جائے
اس سے ان کی دماغی قابلیتیں اس حد تک نشوونما پا جائیں گی۔ کہ
وہ اپنے شوہروں سے تبادلہ خیالات کر سکیں گی۔ اور امومت
کے وہ فرائض خوش اسلوبی سے انجام دے سکیں گی۔ جو میری
رائے میں عورت کے فرائض اولین ہیں۔ تمام وہ مضامین جو
میری رائے میں عورت کے فرائض اولین ہیں۔ تمام وہ مضامین جو
ان کی نسائیت کی نفی کرنے یا اسلام کی حلقہ بگوشی سے انہیں آزاد
کرنے والے ہوں۔ باحتیاط ان کے نصاب تعلیم سے خارج کر دینے چاہئیں
لیکن ہمارے نکتہ آموز ابھی اندھیرے میں راستہ ٹٹولتے پھرتے ہیں انہوں
نے ابھی تک ہماری لڑکیوں کے لئے کوئی خاص نصاب تعلیم معین و مرتب

نہیں کیا۔ اور ان میں سے بعض بزرگوں کی آنکھیں تو مغربی تصورات
کی روشنی سے ایسی چندھیا گئی ہیں۔ کہ وہ ابھی تک اسلام میں جو قومیت کو
ایک خاص ذہنی کیفیت یعنی مذہب پر منحصر قرار دیتا ہے۔ اور مغربیت
میں جس نے قومیت کا محل ایک خارجی سواد یعنی وطن کی بنیاد پر تعمیر کیا
ہے۔ کوئی فرق نہیں سمجھ سکتے۔

اب میں چند خیالات اپنی قوم کے غربا کی عام حالت کی اصلاح
کے متعلق ظاہر کرتا ہوں۔ اس ضمن میں عام طبقہ کے مسلمانوں کی
اقتصادی حالت سب سے پہلے ہمیں اپنی طرف متوجہ کرتی ہے یقیناً
کسی کو اس بات کا انکار نہ ہوگا۔ کہ غریب مسلمان کی اقتصادی
حالت نہایت ہی افسوسناک اور قابل رحم ہے۔ شہروں میں جہاں
کی آبادی کا عنصر غالب مسلمان ہیں۔ معمولی درجہ کے
مسلمانوں کی تعلیل مہ عبرت۔ غلیظ مکان اور ان کے پیٹ بھرے ہوئی
او دستے ہوئے بچوں کا حسرتناک نظارہ کس نے نہیں دیکھا؟
لاہور کے کسی اسلامی محلہ میں جا نکلو۔ ایک پیچ سے تنگ و تاریک کوچہ
پر تمہاری نظر پڑے گی جس کے وحشت زدہ سکوت کے طلسم
کو رہ رہ کر یا تو افسردہ نیم برہنہ بچوں کی چیخ و پکار۔ یا کسی پردہ
نشین بڑھیا کی لجاجت آمیز صدا توڑتی ہوگی جس کی سوکھی
اور مرجھائی ہوئی انگلیاں بوسیدہ چق میں سے نکل کر خیرات کے
لئے پھیلی ہوئی ہونگی۔ یہ تو گلی کی حالت تھی۔ الم زدہ گھروں
کے اندر جاکر دیکھو۔ تو ہمارے مرد اور عورتیں ایسے پاؤ گے جنہوں نے
کبھی اچھے دن دیکھے تھے۔ لیکن آج فاقہ کر رہی ہیں۔ کئی دن سے آج کا

ہیں۔ وہ انگلستان میں اوڈر نہیں گیا۔ لیکن غیرت اور خودداری اجازت
نہیں دیتی۔ کہ خیرات کے لئے کسی کے آگے ہاتھ پھیلائیں۔ ہمارے
نوجوان علم برادران اصلاح۔ تمدن جو پردہ کی رسم کو ہماری
قوم کے قومی سکھ دور و قوموں انحطاط کا باعث قرار دینے کے عادی
ہیں۔ شاید یہ نہیں جانتے کہ اس انحطاط کا اصلی ذمہ دار
پردہ نہیں۔ بلکہ یہ جان فرسا افلاس ہے۔ جو ہماری قوم کے ادنیٰ و
اوقاصی کو کھائے جا رہا ہے۔ علاوہ اس افلاس زدہ طبقہ کے
وہ طبقہ ان نکمے اور نکھٹو افراد کا ہے۔ جو اپنی جیسی ناکاری
و وابستہ اکر کے سستی و کاہلی اور بد اعمالی و سیہ کاری کی زندگی
خود بھی بسر کرتے ہیں۔ اور دوسروں کو بھی اپنا سا بنا لیتے ہیں۔ کیا ہم نے
تمدنی عقدہ کے ان پہلوؤں پر کبھی نظر ڈالی ہے؟ کیا ہم نے کبھی اس
بات کو محسوس کیا ہے؟ کہ ہماری انجمنوں اور مجلسوں کا فرض یہ نہیں
ہے۔ کہ خاص خاص اشخاص کی کلاہ اعزاز و افتخار میں بیٹھے ہوئے
طرّے لگایا کریں۔ بلکہ یہ ہے۔ کہ عام مسلمانوں کی سطح کو
اونچا کریں۔

سب سے زیادہ اہم عقدہ اس مسلمان کے سامنے جو قومی کام کے لئے
اپنے آپ کو وقف کرتا ہے یہ ہے۔ کہ کیونکر اپنی قوم کی اقتصادی حالت
استوار کرے۔ اس کا یہ فرض ہے۔ کہ ہندوستان کی عام اقتصادی حالت
پر نظر غائر ڈال کر ان اسباب کا پتہ لگائے جنہوں نے ملک کی یہ حالت
کر دی ہے۔ اس کا یہ فرض ہے۔ کہ کسی اور مسئلہ پر غور کرنے سے پہلے یہ
دریافت کرے۔ کہ ملک کی اس حالت میں کس حد تک دو بڑی اقتصادی قوتوں نے

صرف کیا ہے۔ جو آج کل کی دنیا میں اپنا عمل کر رہی ہیں۔ کس حد تک
اہل ملک کی تمدنی روایات۔ عادات۔ اوہام اور اخلاقی کمزوریوں
نے غضب کیا۔ اور اگر گورنمنٹ کے طرز عمل کا بھی اس میں کوئی حصہ ہے
تو وہ کس حد تک ہے؟ جو شخص اس گتھی کو سلجھانے کا بیڑہ اٹھانا چاہتا ہے
اسے چاہیئے۔ کہ مذہب و ملت کے اختلاف کی طرف سے مطلق
خالی الذہن ہو جائے۔ اور کسی ایک جماعت کی طرفداری یا پاسداری
کے خیال کو اپنے پاس پھٹکنے نہ دے۔ اس لئے کہ اقتصادی قوتیں تمام
قوموں پر اپنا عمل یکساں کرتی ہیں۔ بشرح مالگذاری کا آئے دن کا
اضافہ۔ مسکرات و ممالک غیر کی اس ملک میں درآمد۔ قیمت اجناس کی گرانی وغیرہ
اس گرانی کا باعث یہ ہو کہ ملک [illegible] وقت کے متعلق تجارت کے قائم کئے
ہوئے اصول غلط ہیں۔ یا یہ کہ ایک زراعتی ملک اور ایک صنعتی ملک کے
درمیان آزاد تجارت کا سلسلہ قائم کر دیا گیا۔ یا کوئی اور سبب ہو۔ یہ تمام
امور ایسے ہیں جو مسلمانوں۔ ہندوؤں۔ سکھوں اور پارسیوں کی
اقتصادی حالت پر یکساں موثر ہو کر نہایت بلند آہنگی سے مساوی کر رہے
ہیں۔ کہ مختلف جماعتوں کے اہل الرائے متفق ہو کر اگر ان باتوں
میں بحث کریں تو اقتصادیات میں مزدور آپس میں صرف ذکر شروع کر
سکتے ہیں۔ اور ملک کی مشترکہ فلاح کی تدابیر بروئے کار لا سکتے ہیں۔ لیکن مسلمان
پیشوایان قوم نے اب تک اپنی تمام توجہ اس مسئلہ پر منعطف کی
ہے۔ کہ سرکاری ڈگریاں ہم لوگوں کو سمجھ رہے کی ملتی رہیں۔ [illegible]
بجائے خود ضرور قابل ستائش ہے۔ اور تاوقتیکہ مسلمانوں کو اپنے
مقصد میں کامیابی نہ ہو۔ ہمارے صرف ہمدردی ملت کو برابر اس

کوشش میں سرگرمی کے ساتھ مصروف رہنا چاہیئے۔ لیکن ساتھ
ہی یہ بات بھی ذہن نشین رکھنی چاہیئے۔ کہ دولت کی پیداوار
کا ذریعہ ہونے کے لحاظ سے سرکاری ملازمت ایک نہایت ہی محدود
ذریعہ ہے۔ سرکاری ملازمت محدود ہے۔ چند اشخاص کو ضرور
آسودہ اور خوشحال بنا دیتی ہے۔ لیکن قوم کے تمام افراد اسی صورت
میں آسودہ اور خوشحال ہو سکتے ہیں۔ جب کہ ان کو اقتصادی آزادی نصیب
ہو۔ اس میں بھی شک نہیں کہ اگر کسی قوم کے چند افراد حکومت کے اعلیٰ
مناصب پر فائز ہوں۔ تو اس قوم کی عزت اور خودداری میں چار
چاند لگ جاتے ہیں۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی صحیح ہے کہ اقتصادی سرگرمی
کے اور بہت سے منافع ہیں۔ جو اہمیت اور سودمندی میں
سرکاری ملازمت کے لگ بھگ ہیں۔ جس قوم کو اپنے اسلاف سے
پائندہ روایات ترکہ میں پہنچی ہوں۔ اس کے لئے نوکری کے
تصورات کو چھوڑ کر تجارت اور صنعت و حرفت کی ڈگر پہ پڑ لینا یقیناً
تکلیف دہ ہے۔ لیکن مغربی اقوام کی دیکھا دیکھی چونکہ ایشیا کی تمام قوموں
کی اقتصادی حالت تغیر پذیر ہوتی جاتی ہے۔ لہٰذا اسے گوارا تو کرنی ہی
پڑے گی۔ علاوہ ان اقتصادی مشکلات کے رفع کرنے کے جو ہماری
سنگ راہ ہیں۔ ہمیں صنعتی تعلیم پر بھی ضرور اپنی توجہ صرف کرنی
چاہیئے۔ جو میری رائے میں اعلیٰ تعلیم سے بھی زیادہ ضروری ہے۔
صنعتی تعلیم سے عام خلائق کی اقتصادی حالت سدھرتی ہے۔ اور یہی
صحیح قوم کے لئے بمنزلہ ریڑھ کی ہڈی کے ہے۔ بخلاف اس کے تعلیم
اعلیٰ صرف ان چند افراد کو نفع پہنچاتی ہے۔ جن کی دماغی قابلیت درجہ

ہفت روزہ رفتار زمانہ لاہور ۲۰ ستمبر ۱۹۳۹ء

اوسط سے بڑھی ہوئی ہوتی ہے۔ ہمارے اغنیاء کے بذل وجود کا مصرف
ایسا ہونا چاہیئے۔ کہ عام مسلمانوں کے بچے ارزاں صنعتی تعلیم حاصل
کر سکیں۔ لیکن صنعتی اور تجارتی تعلیم بلا کسی اخلاقی تربیت کے بجائے
خود کافی و مکتفی نہیں ہے۔ اقتصادی مقابلہ میں تربیت کے اخلاقی
عنصر کی کچھ کم ضرورت نہیں پڑتی۔ اعتماد باہمی۔ دیانت داری
پابندی اوقات۔ روح تعاون وہ اقتصادی اوصاف ہیں۔ جو مہارت
فن کی برابر کی جوڑ ہیں۔ ہندوستان میں بہت سے کارخانے محض
اس لئے نہ چل سکے۔ کہ کارخانہ داروں کو نہ ایک دوسرے پر بھروسہ
تھا۔ اور نہ اصول باہمی ان کا رہنما تھا۔ اگر ہم اچھے کاریگر اور
اچھے دوکاندار۔ اچھے اہل حرفہ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اچھے
شہری پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ تو ہمیں چاہیئے۔ کہ انہیں اول
پکا مسلمان بنائیں۔

2010